انڈیا میں ہجومی قتل عام: دستاویزی رُوداد

ڈاکٹر محمد علم اللہ ○

کہتے ہیں کہ کسی بڑے کام کو انجام دینے کے لیے صرف صلاحیت کافی نہیں ہوتی، اس کے لیے جنون اور ایسی استقامت درکار ہوتی ہے جو آدمی کو بار بار گرنے کے باوجود اسی کام کی طرف واپس لے آئے۔ خاص طور پر جب کام تحقیق، دستاویز سازی اور تاریخ جیسے حسّاس باب سے متعلق ہو۔ جس کے واقعات صرف اعداد و شمار نہیں بلکہ انسانی جانوں، خاندانوں کے المیوں، سماجی خوف اور سیاسی کش مکش سے عبارت ہوں، تو اس کی تکمیل ایک فرد کے معمول کے تحقیقی کام سے کہیں بڑھ کر ایک صبر آزما مہم بن جاتی ہے۔

نئی دہلی کے اشاعتی ادارے 'فاروس' کی جانب سے ڈاکٹر ظفرالاسلام خان کی مرتب کردہ انگریزی کتاب *Mob Lynching in India: A Record 2014-2024* (انڈیا میں ہجوم کے ہاتھوں قتل: ۲۰۱۴ء تا ۲۰۲۴ء کا ریکارڈ) اسی نوعیت کی ایک غیر معمولی دستاویزی کاوش ہے۔ ساڑھے سات سو صفحات پر مشتمل یہ ضخیم دستاویز ایک رپورٹ ہے، مگر اپنی وسعت، واقعات کی کثرت، زمانی و جغرافیائی ترتیب اور معاون مواد کے اعتبار سے ایک موسوعاتی ریکارڈ ہے۔ مئی ۲۰۱۴ء سے مئی ۲۰۲۴ء تک کے عشرے میں انڈیا میں ہجوم کے تشدد اور ماب لنچنگ کے نام سے درج کیے گئے ۱۷۴۳ واقعات کو یکجا کرنا کوئی معمولی کام نہیں ہے، اور اسی لیے اس کے مرتب اور پوری تحقیقی ٹیم کی محنت تحسین کی مستحق ہے۔

اس کتاب کی اہمیت کو سمجھنے کے لیے یہ بات پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ انسانی حقوق کی

○ لندن

بحث میں جذبات اپنی جگہ، مگر اعداد و شمار کی اپنی ایک طاقت ہوتی ہے۔ کسی معاشرے میں ظلم، تشدد، امتیاز یا اقلیتوں کے خلاف زیادتی کی شکایت اس وقت زیادہ مؤثر شہادت بن جاتی ہے، جب اس کے ساتھ تاریخ، مقام، متاثرین، واقعاتی تفصیل، قانونی کارروائی اور دستیاب شواہد کا منظم ریکارڈ بھی موجود ہو۔ ہمارے یہاں اکثر یہ شکایت سننے کو ملتی ہے کہ ظلم وستم کے واقعات تو بہت ہوتے ہیں، مگر ان کا باقاعدہ ریکارڈ محفوظ نہیں کیا جاتا۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ چند برس گزرنے کے بعد واقعات حافظے کا ایک دھندلا حصّہ تو رہتے ہیں، مگر ان کے قابلِ حوالہ شواہد تلاش کرنا دشوار بلکہ ناممکن ہوجاتا ہے۔ اس لیے معاندین کے لیے ان کا انکار آسان ہوجاتا ہے۔ اس اعتبار سے یہ کتاب ایک اہم خلا پُر کرنے کی کوشش ہے، جسے آئندہ محققین، صحافی، انسانی حقوق کے کارکن اور سماجی علوم کے طالب علم مزید تحقیق کے نقطۂ آغاز کے طور پر استعمال کر سکتے ہیں۔

ڈاکٹر ظفرالاسلام خان کسی موضوع کو چھو کر گزر جانے کے قائل نہیں۔ اسی لیے ماب لِنچنگ جیسے بکھرے ہوئے اور مسلسل بدلتے ہوئے موضوع پر ایک عشرے کا ریکارڈ مرتب کرنا خاص اہمیت رکھتا ہے۔ ایسے کام میں اصل دشواری صرف واقعات کی تعداد نہیں ہوتی، بلکہ یہ طے کرنا بھی ہوتا ہے کہ کس واقعے کو شامل کیا جائے؟ مختلف خبروں میں موجود تضادات کو کس طرح دیکھا جائے؟ واقعے کے بعد پولیس اور عدالت کا رویّہ کیا رہا؟ متاثرہ خاندان کا موقف کیا تھا اور بعد کی پیش رفت کو اصل واقعے سے کس طرح مربوط کیا جائے؟ اس نوعیت کے کام میں ایک واقعہ خود ایک مکمل فائل بن جاتا ہے، اور جب ایسے واقعات کی تعداد ہزاروں میں پہنچ جائے تو انھیں جمع کرنا، جانچنا، درجہ بند کرنا اور ایک مربوط دستاویز میں ڈھالنا ایک بڑا تحقیقی کام ہے۔

کتاب کا بنیادی موضوع مئی ۲۰۱۴ء سے مئی ۲۰۲۴ء تک انڈیا میں ہجوم کے ہاتھوں ہونے والے تشدد کا ریکارڈ ہے۔ ڈاکٹر ظفرالاسلام خان کے مطابق: ''یہ اس عرصے میں سامنے آنے والے ۱۷۴۳ واقعات کا دستاویزی مجموعہ ہے''۔ کتاب میں واقعات کے ساتھ ان کے سیاسی، سماجی اور قانونی پس منظر کو بھی زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ کتاب کے شروع میں ڈاکٹر خان صاحب کا تقریباً سو صفحات پر مشتمل مقدمہ خاصا اہم ہے، جس میں ماب لِنچنگ کے تاریخی پس منظر، انڈین صورتِ حال، قانون، شہری معاشرے اور اس رجحان کے ممکنہ اسباب پر تفصیلی گفتگو کی گئی

ہے۔ اس کے بعد کتاب واقعات کے وسیع ریکارڈ، قانونی و انتظامی پہلوؤں، چارٹس اور دیگر معاون مواد کی طرف بڑھتی ہے۔ دادری میں محمد اخلاق کے واقعے پر حقائق کی جانچ پر مبنی رپورٹ، بعض اخبارات کے اداریے، اختصارات وفرہنگ اور مزید مطالعے کے لیے فراہم کیا گیا مواد بھی کتاب کی مجموعی ساخت کا حصّہ ہے۔ یوں اس کے تقریباً پورے حجم پر محیط "۲۰۱۴ء تا ۲۰۲۴ء ماب لنچنگ کے واقعات" کا حصّہ اس منصوبے کی ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے، کیونکہ اسی میں وہ واقعاتی مواد محفوظ کیا گیا ہے، جس پر کتاب کا وسیع تر تجزیہ قائم ہوتا ہے۔

کتاب کی ایک اہم خوبی اس کی زمانی اور جغرافیائی ترتیب ہے۔ واقعات کو تاریخی لحاظ سے ترتیب دیا گیا ہے۔ اس سے ایک محقق کے لیے یہ دیکھنا آسان ہوجاتا ہے کہ مختلف اَدوار میں ہجوم کے تشدد کی نوعیت کیا رہی؟ واقعات کے بعد ایف آئی آر، عدالتی کارروائی اور سزا یا بریت کی صورتِ حال کے بعد کی پیش رفت بھی اس دستاویزی منصوبے کو محض اخباری تراشوں کے مجموعے سے آگے لے جاتی ہے۔ حتی الامکان، انسانی حقوق کی تنظیموں کی حقائق پر مبنی رپورٹس، مقامی ذرائع، متاثرہ خاندانوں اور عینی شاہدین کی رودادوں کو بھی تحقیق کے دائرے میں لانے کی کوشش کی گئی ہے اور کچھ غیر معمولی واقعات جیسے محمد اخلاق، ناصر وجنید، پہلوخان، رکبر اور مظلوم انصاری وغیرہ کے ہجومی قتل کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔

کتاب کی تیاری میں موقر اخبارات، ڈیجیٹل ذرائع ابلاغ، انسانی حقوق کی حقائق پر مبنی رپورٹس، مقامی ذرائع، متاثرہ خاندانوں اور عینی شاہدین کے بیانات اور قانونی کارروائی کے بعد کی پیش رفت سے استفادہ کیا گیا ہے، اور دہلی کے اخبارات، بعض خبری ذرائع اور سوشل میڈیا کی پوسٹوں کو کھنگال کر واقعات جمع کیے گئے ہیں۔ وسائل کی کمی کے باعث ملک کے ہر تھانے، ہر مقامی اخبار اور مختلف علاقائی زبانوں کے ذرائع تک رسائی ممکن نہ ہونے کا اعتراف بھی کیا گیا ہے۔ یہ اعتراف کتاب کی تحقیقی دیانت داری کی علامت ہے۔ اسی طرح پولیس یا جیل میں ہونے والی ہلاکتوں اور اِنکاؤنٹرز کو اس مطالعے سے الگ رکھنے کا ذکر کرتے ہوئے انھیں کسی الگ تحقیق کا موضوع بنانے کی بات کی گئی ہے۔ یہ حد بندی واضح کرتی ہے کہ کتاب میں 'ہجوم کے تشدد' سے مراد ایک مخصوص دائرۂ کار میں آنے والے واقعات ہیں، نہ کہ

انڈیا میں ہونے والی ہر غیر قانونی یا مشتبہ ہلاکت۔

کتاب کے بیانیے میں ۲۰۱۴ء ایک فیصلہ کن موڑ کی حیثیت رکھتا ہے۔ محقق کے مطابق مئی ۲۰۱۴ء میں بھارتیہ جنتا پارٹی کے اقتدار میں آنے کے بعد ماب لِنچنگ میں نمایاں اضافہ ہوا، بالخصوص مسلمانوں کے خلاف تشدد میں، اور اس رجحان کو 'ہندوتوا' کی سیاست، گئو رکشا کے نام پر سرگرم گروہوں، پولیس کی بےعملی اور بعض حالات میں مجرموں کو حاصل ہونے والے سیاسی و سماجی تحفظ سے جوڑا گیا ہے۔ کتاب کے تعارف اور مقدمے میں ہجوم کے تشدد کو ایک 'نئی قسم کی دہشت گردی' قرار دیا گیا ہے اور 'لِنچستان' (Linchistan) جیسی اصطلاح بھی استعمال کی گئی ہے۔ ڈاکٹر ظفرالاسلام کے مطابق ماب لِنچنگ محض کچھ افراد کے بےقابو ہو جانے کا نام نہیں، بلکہ بعض واقعات ایک ایسے ماحول کی علامت ہیں، جس میں خوف کو اجتماعی سطح پر سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

۲۰۱۴ء کو انڈیا میں ہجوم کے تشدد یا اجتماعی قتل کے وسیع تر تاریخی پس منظر میں دیکھیں تو تقسیمِ ہند کے دوران بڑے پیمانے پر ہونے والے فسادات، ۱۹۸۴ء کا سکھ مخالف تشدد، ۲۰۰۲ء کا گجرات تشدد اور اس سے پہلے اور بعد کے متعدد فرقہ وارانہ واقعات اس بات کی یاددہانی کراتے ہیں کہ ہجوم، فرقہ واریت اور اجتماعی تشدد، جدید انڈین تاریخ میں ۲۰۱۴ء سے پہلے بھی موجود رہے ہیں۔ اس لیے ۲۰۱۴ء کو ایک سیاسی، سماجی یا ابلاغی موڑ کے طور پر دیکھنا زیادہ محتاط تعبیر ہے، نہ کہ ہجوم کے تشدد کی پیدائش کے سال کے طور پر۔

اسی ضمن میں امریکا میں افریقی نژاد امریکیوں کے خلاف تاریخی لِنچنگ سے بھی تقابل کیا گیا ہے اور ایڈا بی ویلز بارنیٹ کی اس تشریح کو پیش کیا گیا ہے کہ ایسے قتل کا مقصد صرف ایک شخص کو ختم کرنا نہیں، بلکہ پوری برادری میں خوف پیدا کرنا اور اس کی آزادی کی حدود متعین کرنا بھی ہوتا ہے۔ انڈین تناظر میں کتاب اسی تصور کو مسلمانوں اور دیگر اقلیتوں کے خلاف ہونے والے ہجومی تشدد پر منطبق کرتی ہے۔ یہ تقابلی زاویہ اس اعتبار سے اہم ہے کہ وہ ماب لِنچنگ کو صرف قتل کے ایک واقعے کے بجائے اجتماعی خوف، سماجی دباؤ اور طاقت کے اظہار کے تناظر میں دیکھنے کی کوشش کرتا ہے۔

کتاب کے چارٹس اس پیچیدہ صورت حال کو مزید نمایاں کرتے ہیں۔ مئی ۲۰۲۴ء تک کے چارٹ کے مطابق دستاویزی واقعات میں ہندو متاثرین کی ہلاکتیں ۷۸۷ ہیں، جب کہ مسلمان متاثرین کی ہلاکتیں ۳۷۲ درج کی گئی ہیں۔ اس کے علاوہ دلتوں کی ۸۵، قبائلی یا آدیواسی افراد کی ۳۱، سکھوں کی ۱۷، عیسائیوں کی ۱۴، پولیس، فوجی یا سرکاری اہلکاروں کی ۱۴ اور نامعلوم شناخت کے ۱۰۲ افراد کی ہلاکتیں درج ہیں۔ دیگر متفرق زمروں کو ملا کر ان دس برسوں میں ہجومی تشدد میں ہونے والی انسانی ہلاکتوں کا مجموعہ تقریباً ۱۴۴۶ بنتا ہے۔ کتاب خود واضح کرتی ہے کہ یہ اس کے مطالعے میں دستاویزی واقعات اور ہلاکتوں کا ریکارڈ ہے جس کی رپورٹنگ ایک خاص علاقے میں ہوئی، اس لیے اصل تعداد اس سے کہیں زیادہ ہوسکتی ہے۔

وجوہ کے چارٹ سے یہ بات مزید واضح ہوتی ہے۔ ۵۷۱ واقعات لڑائی، سڑک پر اشتعال انگیزی یا عام جھگڑوں سے متعلق درج ہیں۔ چوری کے الزام سے متعلق واقعات ۲۸۴ ہیں۔ پرانی دشمنی یا سیاسی رقابت کے ۱۶۹، بین المذاہب شادیوں یا محبت کے معاملات ۱۴۱، مذہبی شناخت، بالخصوص مسلمان ہونے کی بنیاد پر ۸۹، بچہ اٹھانے کے الزام کے ۵۳، گائے یا بھینس کی اسمگلنگ کے ۵۷، بیف یا گائے ذبح کرنے کے الزام کے ۵۳، اور جادوٹونے کے الزام کے ۵۰ واقعات درج کیے گئے ہیں۔ اس طرح خود کتاب کے فراہم کردہ اعداد و شمار یہ بتاتے ہیں کہ گائے، بیف یا مذہب سے متعلق واقعات اگرچہ نہایت سنگین اور بعض اوقات واضح طور پر فرقہ وارانہ نوعیت کے حامل ہیں۔ یہ اعداد و شمار اس امر کی طرف بھی اشارہ کرتے ہیں کہ انڈیا میں ہجوم کے تشدد کے محرکات مذہبی تعصب کے ساتھ ساتھ سماجی، شخصی اور سیاسی نوعیت کے بھی ہیں۔

ریاستی تقسیم دیکھیں: اتر پردیش ۴۲۲ واقعات کے ساتھ سب سے اُوپر ہے۔ اس کے بعد دہلی ۲۹۶، بہار ۱۷۳، ہریانہ ۱۰۰، راجستھان ۹۷، مہاراشٹر ۹۴، مدھیہ پردیش ۹۲ اور جھارکھنڈ ۷۱ واقعات کے ساتھ آتے ہیں۔ دہلی کے ۲۹۶ واقعات خصوصاً قابلِ توجہ ہیں، کیونکہ دارالحکومت اور ایک نسبتاً محدود جغرافیائی خطے میں درج یہ تعداد کئی بڑی ریاستوں سے زیادہ ہے۔ ایسے واقعات کی تشریح کرتے وقت آبادی، شہری کثافت، ذرائع ابلاغ کی موجودگی، رپورٹنگ کی سہولت، پولیس تک رسائی اور واقعات کے دستاویزی ہونے کے امکانات جیسے

عوامل بھی پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے۔

اعداد وشمار کی یہی پیچیدگی انڈین معاشرے میں ہجوم کو قانون اپنے ہاتھ میں لینے کی طرف لے جانے والے عمومی سماجی اسباب پر غور کرنے کی دعوت دیتی ہے۔ اگر ۵۷۱ واقعات عام لڑائی، سڑک پر اشتعال انگیزی یا جھگڑوں سے اور ۲۸۴ چوری کے الزامات سے متعلق ہیں، تو یہ سوال بھی اہم ہے کہ انڈین معاشرے میں ہجوم کو قانون اپنے ہاتھ میں لینے کی طرف لے جانے والے عمومی سماجی اسباب کیا ہیں؟ اگر مذہبی شناخت کی بنیاد پر مسلمانوں کے خلاف ۸۹ واقعات درج ہیں، گائے یا بھینس کی اسمگلنگ سے متعلق ۵۷ اور بیف یا گائے ذبح کرنے کے الزامات سے متعلق ۵۳ واقعات ہیں، تو ان مخصوص واقعات کی نوعیت کیا ہے؟ ان میں مذہبی تعصب کس حد تک بنیادی محرک تھا اور دوسرے تنازعات کے ساتھ کس طرح جڑا ہوا تھا؟ اسی طرح مختلف طبقات کے خلاف ہجوم کے تشدد کے محرکات الگ الگ ہیں یا نہیں، یہ بھی مزید تحقیق کا ایک اہم موضوع ہوسکتا ہے۔

کتاب کے بعض گوشے اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ محقق نے ہر واقعے کو صرف مذہبی زاویے سے درجہ بند کرنے کے بجائے متعدد محرکات کو الگ الگ دکھانے کی کوشش کی ہے۔ تین جانوروں کی ہلاکتوں کو انسانی ہلاکتوں سے الگ درج کرنا، 'مسلم تشدد'، 'نکسل تشدد'، 'جہیز' اور 'سیاسی تشدد' جیسے الگ زمرے بنانا اسی رجحان کی مثال ہے۔ خود اس درجہ بندی میں ایک ایسے وسیع تر مسئلے کی طرف اشارہ ملتا ہے جس میں مذہبی تعصب، سماجی تنازعات، افواہیں، ذاتی دشمنی، سیاسی رقابت اور قانون شکنی کے دوسرے محرکات ایک دوسرے سے الگ بھی ہیں اور بعض صورتوں میں ایک دوسرے سے جڑ بھی جاتے ہیں۔

کتاب کے مقدمے میں پونا میں محسن شیخ کی ۲۰۱۴ء میں ہلاکت، دادری میں محمد اخلاق کی ۲۰۱۵ء کی ہلاکت، پہلو خان، رکبر عرف اکبر خان اور علیم الدین انصاری جیسے واقعات خاص طور پر نمایاں ہیں۔ گائے، بیف یا گئو رکشا کے نام پر ہونے والے یہ واقعات کتاب کے مرکزی استدلال کا اہم حصّہ ہیں۔ دادری کا واقعہ اس قدر اہم سمجھا گیا ہے کہ اسے الگ حقائق پر مبنی رپورٹ کی صورت میں ضمیمے کے طور پر شامل کیا گیا ہے۔ اسی طرح کتاب میں بعض

مقدمات کی بعد کی عدالتی پیش رفت، ضمانت، گواہوں کے مسائل، مقدمات کی سست روی اور بعض مواقع پر مقدمات واپس لینے کی کوششوں کا ذکر بھی موجود ہے۔

کتاب میں ریاستی اداروں، خصوصاً پولیس اور انتظامیہ، کے کردار پر بھی گفتگو کی گئی ہے۔ بعض واقعات میں یہ الزام سامنے آتا ہے کہ پولیس نے زخمی متاثرین کی فوری مدد کے بجائے مویشیوں کو ترجیح دی۔ کہیں مقتول کے خاندان کو قانونی دستاویزات کے حصول میں دشواری ہوئی۔ کہیں گواہوں پر دباؤ اور دھمکی کی شکایت سامنے آئی، اور کہیں ملزمان کی جلد ضمانت یا ان کے ساتھ سیاسی ہمدردی نے انصاف کے عمل پر سوال اٹھائے۔ علیم الدین انصاری کے مقدمے کے حوالے سے مرکزی وزیر جے سنہا کی جانب سے ضمانت پر رہا ہونے والے افراد کے استقبال اور ان کی مالی اعانت کا ذکر بھی کتاب میں موجود ہے، جسے وہ اپنے اس استدلال کے ضمن میں پیش کرتی ہے کہ جب سیاسی یا سماجی اثر ورسوخ قانون کے عمل پر غالب آجائے تو ہجوم کے تشدد کے خلاف قانونی کارروائی کمزور پڑ سکتی ہے۔

اسی قانونی پس منظر میں سپریم کورٹ کی ۲۰۱۸ء کی ہدایات بھی کتاب کے اہم مباحث میں شامل ہیں۔ شہری معاشرے کی جانب سے 'ماسکا'، یعنی 'مانو سُرکشا قانون'، جیسے مجوزہ قوانین کا ذکر بھی آتا ہے، جب کہ مغربی بنگال سمیت بعض ریاستوں میں انسدادِ لنچنگ قانون سازی کی کوششوں کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ کتاب کا مطالبہ ایک ایسے مضبوط خصوصی قانون کا ہے، جو ہجوم کے ذریعے قتل وتشدد کو واضح طور پر متعین کرے، پولیس اور انتظامیہ کی ذمہ داری مقرر کرے، متاثرین اور گواہوں کو تحفظ دے اور سیاسی مداخلت کے امکانات کو ختم کرے۔ نئے فوجداری قانونی ڈھانچے، بالخصوص بھارتیہ نیائے سنہتا، کے بارے میں بھی کتاب کا موقف یہ ہے کہ ہجوم کے تشدد سے نمٹنے کے لیے مخصوص اور مؤثر قانون اب بھی درکار ہے۔

کتاب میں کئی اہم سوالات اُٹھائے گئے ہیں: اگر کسی شخص پر چوری، قتل، گائے کی اسمگلنگ، مذہبی جرم یا کسی اور جرم کا الزام ہو تو بھی اسے سزا دینے کا حق ہجوم کو نہیں۔ جرم کا تعین عدالت کرے گی، سزا عدالت دے گی اور قانون سب کے لیے یکساں ہوگا۔ الزام جرم نہیں ہوتا اور شبہ سزا نہیں ہوتا۔ ایک مہذب معاشرے میں کسی شخص کو سڑک پر کھڑا ہجوم نہ مجرم قرار

دے سکتا ہے اور نہ سزا دے سکتا ہے۔ اس اعتبار سے یہ کتاب قانون کی حکمرانی کے ایک بنیادی اصول کی یاد دہانی بھی کراتی ہے۔ اگر اس اصول کو واقعی عالم گیر بنا دیا جائے تو ماب لِنچنگ کے خلاف جدوجہد محض مسلمانوں، ہندوؤں، دلتوں، عیسائیوں یا کسی ایک گروہ کی جدوجہد نہیں رہتی، بلکہ انسانی وقار اور قانون کی حکمرانی کی مشترکہ جدوجہد بن جاتی ہے۔

کتاب میں سوشل میڈیا کے کردار پر بھی خاص توجہ دی گئی ہے۔ آج کسی واقعے کی ویڈیو بنانا، اسے فوری طور پر پھیلانا اور تشدد کو ایک طرح کے تماشے یا فخریہ مظاہرے میں بدل دینا ماضی کے ہجوم کے تشدد سے ایک اہم فرق پیدا کرتا ہے۔ کتاب کے مطابق بعض قاتل یا حملہ آور اپنے اعمال کی ویڈیوز بناتے اور انھیں سوشل میڈیا پر نشر کرتے ہیں۔ افواہیں، جھوٹی خبریں، نفرت انگیز تقاریر اور اشتعال انگیز مواد چند لمحوں میں وسیع حلقے تک پہنچ جاتے ہیں اور کسی معمولی شبہے کو اجتماعی تشدد میں تبدیل کر سکتے ہیں۔ یہ مسئلہ صرف مذہبی تشدد تک محدود نہیں۔ بچہ و مویشی چوری، ڈکیتی، جادوٹونے اور دیگر افواہوں سے بھی ہجوم اس اطلاعاتی ماحول میں طاقت حاصل کر سکتا ہے۔ اس لیے ڈیجیٹل پلیٹ فارموں کی ذمہ داری، میڈیا خواندگی اور افواہوں کی بروقت تردید، انسدادِ لِنچنگ کی کسی بھی جامع پالیسی کا لازمی حصّہ ہونا چاہیے۔

میڈیا کے کردار پر کتاب کا باب بھی اس سلسلے میں خاصا اہم ہے۔ اس میں یہ بات سامنے آتی ہے کہ بعض میڈیا ادارے اپنے انگریزی، ہندی اور اردو اخبارات میں ایک ہی واقعے کو مختلف انداز اور مختلف زبان کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ بعض حساس اور فرقہ وارانہ معاملات میں پولیس پریس ریلیز میں غیر مصدقہ اطلاعات کو مناسب تحقیق کے بغیر شائع کرنے، قارئین کے جذبات کو ابھارنے، سنسنی خیزی پیدا کرنے اور مخصوص ہدفی قارئین کو مطمئن کرنے کے لیے صحافتی اصولوں کو پسِ پشت ڈالنے کی شکایات بھی درج ہیں۔ زبان کے انتخاب، الفاظ کی ساخت اور خبر کی ترتیب کے ذریعے کسی مخصوص مذہبی یا سماجی گروہ کے بارے میں ایک خاص تاثر پیدا کرنے کا مسئلہ بھی زیرِ بحث آتا ہے۔ اقلیتوں، خصوصاً مسلمانوں، کے مسائل کو کبھی نظرانداز کرنے اور کبھی منفی یا تعصب زدہ زاویے سے پیش کرنے کا ذکر بھی کتاب میں موجود ہے۔

اسی طرح نوجوانوں، بے روزگاری اور سیاسی و نظریاتی تنظیم سازی کے باہمی تعلق پر

بھی کتاب میں گفتگو ملتی ہے۔ اس میں 'گئورکشک'، بجرنگ دل اور دوسرے انتہا پسند گروہوں کے حوالے سے یہ مؤقف سامنے آتا ہے کہ معاشی محرومی، بے روزگاری اور سیاسی ونظریاتی تنظیم سازی بعض نوجوانوں کو تشدد کے لیے دستیاب افرادی قوت میں تبدیل کرسکتی ہے۔ ہتھیاروں کی نمائش اور شَستُر پوجا جیسے مظاہر کو بھی کتاب ایک ایسے وسیع تر ثقافتی ماحول کے ساتھ جوڑتی ہے جس میں تشدد کو معمول یا قابلِ فخر عمل بنانے کا رجحان پیدا ہوسکتا ہے۔ یہ سوال بہرحال اہم ہے کہ بے روزگاری، نوجوانوں کی سیاسی تنظیم سازی، سوشل میڈیا اور نفرت انگیز بیانیے باہم مل کر اجتماعی تشدد کو کس طرح جنم دیتے ہیں؟ کتاب میں یہ بھی تفصیل سے واضح کیا گیا ہے کہ نام نہاد گئورکشکوں نے گئورکشا کے نام پر کھربوں کے جانور اور مویشی تاجروں اور ٹرک ڈرائیوروں کے بے شمار پیسے لوٹ لیے۔

کتاب کی انسانی جہت اس کے خشک اعداد وشمار کو ایک الگ معنویت عطا کرتی ہے۔ آسنول، مغربی بنگال کے مولانا امداد اللہ رشیدی کا واقعہ اس سلسلے میں نہایت اثر انگیز مثال ہے۔ ایک ہندو انتہا پسند ہجوم کے ہاتھوں ان کے سولہ سالہ بیٹے محمد صِبغۃ اللہ کے قتل اور لاش جلائے جانے کے باوجود انھوں نے انتقام کے بجائے امن اور ضبط کی اپیل کی اور کہا کہ اسلام بدلے کے بجائے صبر ومعافی کی تعلیم دیتا ہے۔ انھوں نے اعلان کیا کہ اگر مسلمان تشدد کریں گے تو وہ شہر چھوڑ دیں گے۔ اسی طرح ۲۲ مئی ۲۰۱۸ء کو دہرادون میں ایک سکھ پولیس افسر نے جان پر کھیل کر ایک مسلم نوجوان کو ہندو بھیڑ سے بچایا۔ اس طرح کے واقعات ہمیں یاد دلاتے ہیں کہ اجتماعی نفرت کے مقابلے میں انسانی اخلاق کی اصل آزمائش اسی وقت ہوتی ہے جب انسان کو صحیح اور غلط کے درمیان ایک بات کو فوری طور پر چننا ہوتا ہے۔

کتاب کی اشاعت کا سال بھی ایک قابلِ توجہ پہلو ہے۔ کتاب ۲۰۲۶ء میں چھپی ہے، جب کہ عنوان کے مطابق کتاب ۲۰۱۴ء تا ۲۰۲۴ء کا ریکارڈ پیش کرتی ہے۔ اس میں بعض اہم مقدمات کی بعد کی پیش رفت بھی شامل ہے، خصوصاً محمد اخلاق کے مقدمے سے متعلق ۲۰۲۶ء تک کی معلومات درج ہیں۔ اس طرح کتاب کا بنیادی تاریخی خاکہ ایک عشرے کا ہے، لیکن اس کی بعض قانونی و واقعاتی معلومات اس دائرے سے آگے جاتی ہیں۔

ڈاکٹر ظفرالاسلام خان صاحب کو ملّی گزٹ کے آغاز، ۲۰۰۰ء سے ہی جان سے مارنے کی دھمکیاں ملتی رہی ہیں۔ مئی ۲۰۰۴ء میں ایک شخص نے ای میل کے ذریعے کھلی دھمکی دی کہ 'ہٹ اسکواڈ بھیجا جائے گا' اور 'تم سب جلد مر جاؤ گے'۔ ۲۰۱۶ء میں وزارتِ آیوش پر رپورٹ شائع ہونے کے بعد رپورٹر کو گرفتار کیا گیا، پریس کونسل نے نوٹس جاری کیا اور دہلی پولیس نے اخبار کا ڈیکلریشن منسوخ کرنے کا نوٹس بھیجا۔ اپریل-مئی ۲۰۲۰ء میں سوشل میڈیا یا پوسٹ پر بغاوت کا مقدمہ درج ہوا، گھر پر چھاپہ پڑا، موبائل اور لیپ ٹاپ وغیرہ قبضے میں لیا گیا اور گرفتاری کی کوشش کی گئی۔ اکتوبر ۲۰۲۰ء میں این آئی اے نے دیوار پھاند کر ڈاکٹر ظفرالاسلام کے گھر اور 'چیریٹی الائنس' کے دفتر پر چھاپہ مارا، دستاویزات، بہت سے لیپ ٹاپ، لاتعداد ہارڈ ڈرائیوز اور کاغذات اور پیسے اٹھا کر لے گئی۔ کوئی مقدمہ آج تک نہیں چلا، مگر کچھ ضبط شدہ سامان بھی واپس نہیں ملا۔

کتاب صرف ہجوم کے ہاتھوں مارے جانے والوں کا ریکارڈ نہیں، بلکہ اس سوال کا بھی ریکارڈ ہے کہ ایک معاشرہ اپنے قانون، اپنے ضمیر اور اپنی انسانیت کے ساتھ کہاں کھڑا ہے؟ اس کتاب کو اسی سوال کے ساتھ پڑھنا چاہیے، کھلی آنکھ اور مکمل انسانی حساسیت کے ساتھ۔ اس کے اعداد و شمار کو دیگر سرکاری، عدالتی، صحافتی اور تحقیقی ذرائع سے جانچا جا سکتا ہے۔ اس کے دعوؤں پر علمی بحث ہو سکتی ہے اور جہاں اس کی تصویر نامکمل ہو وہاں مزید تحقیق سے اسے مکمل کیا جا سکتا ہے۔ لیکن ایک حقیقت اپنی جگہ قائم رہتی ہے: ہجوم کے ہاتھوں کسی انسان کی جان لینا، خواہ وہ کسی بھی مذہب، ذات یا طبقے سے تعلق رکھتا ہو، قانون اور انسانیت دونوں کی شکست ہے۔ ایک ایسا معاشرہ جو اس حقیقت کو تسلیم کر لے اور انصاف کو ہجوم سے واپس عدالت کے ہاتھ میں دے دے، وہی اپنے جمہوری مستقبل کو محفوظ کر سکتا ہے۔